چیف ایڈیٹر
ڈاکٹر ایس عنایت علی شاہ
نقوی

دشمنوں نے مدینہ میں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا آخر کار تنگ آکر جنگ کیلئے تیار ہونا پڑا۔ کئی لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں
شکست ہمیشہ ابوسفیان ہی کو ہوئی۔ حضرت محمدؐ کے پیروؤں کی تعداد اور ان کی طاقت برابر بڑھ رہی تھی۔ آخر
مکہ میں ایک ایسی فیصلہ کن جنگ ہوئی جس نے بنی امیہ کی طاقت بالکل توڑ دی۔ اب اپنی کمزوری کو چھپانے کیلئے
انھوں نے بھی قبول اسلام کی نقاب ڈال لی۔

اس شکست کے بعد ایک مدت تک بنی امیہ سر نہ اٹھا سکے۔ حضرت محمدؐ کے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ نے
اپنی حکومت کے زمانہ میں ابوسفیان کے بڑے بیٹے یزید کو اور یزید کی وفات کے بعد اس کے بھائی معاویہ کو
امیر شام مقرر کیا۔ امیر معاویہ کی تقرری سے بنی امیہ کا زوال عروج سے بدلنے لگا۔ اور رفتہ رفتہ دولت
اور خصوصیت بھی ان کے قبضے میں آگئی۔ رسول عربی کے تیسرے خلیفہ حضرت عثمان خود بھی امیہ ہی سے
تھے ان کے عہد حکومت میں بنی امیہ کو خوب عروج ہوا۔

جب حضرت علی رسولؐ کے چوتھے خلیفہ ہوئے تو ہوا کا رخ بدل گیا۔ آپ شاہانہ اقتدار کے باوجود
فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ضرورت کے وقت یہودیوں کے باغوں میں پانی دے کر اپنی روزی پیدا
کرتے تھے مگر قومی خزانہ میں ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ اب یہ کہاں ممکن تھا کہ کوئی فرد یا کوئی جماعت بیت المال
سے بے استحقاق متمتع ہو سکے چنانچہ سرداران عرب کو جو وظیفے بیکار رل رہے تھے وہ سب آپ نے بند
کر دیئے۔

حضرت علی حضرت ہاشم کے پرپوتے اور پیغمبر عرب یعنی حضرت محمدؐ کے چچا زاد بھائی تھے۔ اولادِ
ہاشم کی حکومت یوں ہی بنی امیہ کیلئے قابل برداشت نہ تھی اس پر حضرت علی کی سخت گیری۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ مخالفت کی چنگاریاں دیکھتے دیکھتے جنگ کی آگ بھڑک اٹھی اور بنی امیہ نے حاکم شام امیر معاویہ
کی سرکردگی میں حضرت علی سے کئی لڑائیاں لڑیں۔ حضرت علی اسلام کے سب سے بڑے سپاہی اور فنون
جنگ کے سب سے بڑے ماہر تھے۔ میدان ہمیشہ انھیں کے ہاتھ رہا۔ جب تیغ و شمشیر سے مقصد حاصل نہ ہوا
تو عیاری اور مکاری کے حربے استعمال ہونے لگے۔ آخر ماہ رمضان ۴۰ھ میں حضرت علی مسجد کوفہ میں
نماز صبح کے وقت ایک مسموم حربے سے شہید کر دیئے گئے۔

حضرت علی کی شہادت سے بنی امیہ کا راستہ کسی قدر صاف ہو گیا لیکن بنی ہاشم تقدس، روحانیت، خلوص
اخلاق میں بنی امیہ سے کہیں افضل تھے اور رسول کی قرابت کا شرف صرف انھیں کو حاصل تھا۔ اس لیے روحانی
سیادت کا بنی ہاشم سے بنی امیہ میں منتقل ہو جانا اب بھی مشکل تھا چنانچہ حضرت علی کے بعد ان کے بڑے بیٹے حضرت حسن
خلیفہ بلا فصل تسلیم کر لیے گئے۔

(باقی آئندہ)

چندہ سالانہ ع

بیرون ہند سے

إِنَّ الدِّينَ عِندَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

اسلامی دنیا

زیر سرپرستی

حضرت قمر الواعظین لسان الملۃ ناصر الشریعت ثقۃ الاسلام مولانا مولوی محمد لقاء علی صاحب حیدری مدظلہ العالی

مینیجر مسئول حکیم ڈاکٹر مولوی سید عنایت علی شاہ نقوی ایل۔ڈی۔ای۔ایم۔ایس۔ایس۔ایچ۔ای۔ایچ۔پی لکھنؤ

جلد ۹

بابتہ ماہ جولائی و اگست و ستمبر ۱۹۴۲ء

نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
۱	شذرات	مدیر	۲
۲	جلسہ ہائے یادگار حسینی	حسن افضل بدر نائب مدیر	۲-۱۰
۳	حسین کا پیغام عالم انسانیت کے نام	حضرت سید العلما مدظلہ العالی (گزشتہ سے پیوستہ)	۱۱-۱۳
۴	واقعہ کربلا اور اس کے نتائج	از علامہ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم۔اے صدر شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی	۱۴-
۵	حرم پاک (نظم)	از علیہ مہد نواب سردار بیگم، اختر حیدرآبادی	۱۵
۶	سلام	سید محسن صاحب لکھنوی، از حیدرآباد	۱۶
۷	″	نواب محمد معین خاں صاحب بہادر نعیم جاگیردار حیدرآباد	۱۶
۸	منقبت	حضرت حافظ محمد یوسف علی خاں صاحب عزیز الملک سیمابی امام مسجد	۱۷-
۹	حضرت امام حسین ؑ	حضرت مولانا رحم سجے پور	۱۷-۲۰
۱۰	خدا کی پروردگاری	مولوی عنایت اللہ صاحب روشن بدایونی	۲۰

شذرات

اسلامی دُنیا کا چھٹا سال شروع ہو چکا ہے پہلے نمبر کی ابتدا جون سے کی گئی۔ چونکہ چند ماہ کا درمیان میں فاصلہ اشاعت میں ہو گیا تھا اس لیے سال نو بجائے مارچ کے جون سے شروع کیا گیا۔ خیال تھا کہ جولائی کا پرچہ بروقت شایع کر کے آئندہ ماہ بماہ پرچہ شایع کرتے رہیں گے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ہمارے رسالے کے گردش کے ایام ختم نہیں ہوئے ہیں۔ نہ کاغذ اب تک ملا ہے نہ خریدار صاحبان کو توجہ کا موقع ملا۔ لیکن ہم بھی ہیں دھن کے پکے جب تک ہمارے کم توجہ پانے والے خریدار صاف انکار نہ کر دیں گے اُس وقت تک ہم اُن کے پاس رسالہ بھیجتے رہیں گے دیکھیں کب تک توجہ نہ فرمائیں گے۔ سارا ملک اقتصادی کشمکش میں ہے اور اس کا اثر قومی اور مذہبی اداروں پر سب سے زیادہ ہے۔ ہمارا غریب ادارہ بھی اُن میں سے ایک ہے آخر یہ کس طرح سے زد سے بچ سکتا تھا۔ جہاں ہمکو کم توجہ حضرات کا شکوہ یا گلہ ہے وہاں ناشکرگزاری ہوگی اگر توجہ فرمانے والے حضرات کا شکریہ صمیم قلب سے ادا نہ کریں خدا جزائے خیر دے اُن تمام حضرات کو جو خدمت دینی کی اہمیت کا صحیح اندازہ فرما کے دینی اداروں کی ہمت افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم جبریہ بھرتی کے قائل نہیں ہیں ایسے لوگ وقت پر دھوکا دے جاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے رسالے کے خریدار صرف وہ حضرات ہیں جنھوں نے کمال خوشدلی سے رسالے کا اجرا منظور فرمایا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ بعض حضرات کو اب تک چندہ بھیجنے کی طرف توجہ کا موقع نہ ملا ہے۔ ہم ایک امر تنبیہاً ان حضرات کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے اپنا فوٹو بغرض اشاعت دیا تھا کہ وہ اپنے ذمہ کا روپیہ جلد بھیج دیں جو فوٹو ابھی شایع نہیں ہوئے ہیں اُن میں سے اکثر کے بلاک تیار ہو گئے ہیں اور اشاعت صرف رقم کے وصول ہونے پر ملتوی رکھی گئی ہے البتہ ان حضرات پر ضرور گراں ہوگا جنھوں نے رقمیں ادا کر دی ہیں لیکن فوٹو ابھی شایع نہیں ہو سکے انشاء اللہ تعالیٰ بہت جلد کسی خاص نمبر میں یا رفتہ رفتہ فوٹو شایع کیے جائیں گے جن حضرات کی رقوم وصول ہو چکی ہیں اور فوٹو شایع نہیں ہوا ہے اُن سے ہم تاخیر کی معافی کے طالب ہیں بہت جلد شایع کرنے والے ہیں۔ (خاکسار ایڈیٹر)

جلسہ ہائے یادگار حسینی

(از حسین افضل عبدی نائب مدیر اسلامی دنیا)

گزشتہ اشاعت میں ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ان جلسوں کی کارروائی آئندہ درج کی جائیگی
جن میں حضرت قمر الاعظمین نے شرکت فرمائی اور اپنی بصیرت افروز تقاریر سے عام و خاص مجمع
پر وہ اثر پیدا کیا جو یادگار رہیگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس سلسلہ میں حضرت سید العلماء مدظلہ العالی
کا نام خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل ہے آپ کی تقریر ہر حیثیت سے ہر مقام پر مکمل تھی اور دعوے کے
ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سارے ملک میں جتنی تقریریں مختلف جلسوں میں ہوتی ہیں ان سب
میں جناب کی تقریر گل سرسبد ہے اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیے تھا لیکن حضرت قمر الاعظمین
کی تقاریر بھی ان تمام جلسوں میں جن میں آپ نے شرکت فرمائی تھی بیحد مقبول خاص و عام ہوئیں
مشکل سے ہندوستان کا کوئی مشہور مقام ایسا نکلے گا جہاں یہ مبارک جلسے قائم نہ کیے گئے ہوں
اور وہاں عام طور پر اہالیان شہر نے دلچسپی کا اظہار نہ کیا ہو۔ جن جلسوں کی روئداد ہمارے دفتر
میں موصول ہوئی ہے اس کو ہم باوقات مناسب شائع کریں گے۔ ان جلسوں سے بعض حضرات
کو اختلاف بھی ہوا اور اکثر نے تو بلاتکلف فرما دیا کہ یادگار تو حسینی سالانہ محرم میں منائی جاتی ہے پھر اس سال
کی یادگار کو اتنی کیوں اہمیت دی جائے۔ بعض حضرات نے دریافت کیا کہ یادگار سے کیا مراد ہے
اور کیا شئے یادگار کو ظاہر کرنے کے واسطے منائی جاتی ہے۔ کہنے والوں کو جواب مناسب دیا گیا
لیکن اندیشہ ہے کہ کہیں غلط فہمی اب بھی باقی نہ رہ جائے اس لیے ہم بھی اپنی حیثیت کے مطابق
جواب شائع کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ لکھنؤ کا مرکزی ادارہ اس سے بہتر جواب دے سکیگا۔

(۱) اس میں شبہ نہیں کہ ہر سال ماہ محرم میں مجالس عزا کی بنا کی جاتی ہے۔ عزاخانے جہاں بھی
ہیں ان کو آراستہ کیا جاتا ہے اور صف ماتم بچھائی جاتی ہے اور یہ سب یادگار ہی ہے۔ لیکن اس قسم
کے سوال کرنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یادگار کا مفہوم اور مقصد کیا ہوتا ہے اور ہونا چاہیے صرف

چند مخصوص مقامات پر ایک خاص جماعت کی قیادت میں مجالس کا انعقاد عمومی حیثیت نہیں رکھتا
اور "یادگار" کے مقصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ یقیناً مجالس عزا بہترین ذریعہ یادگار ہو سکتی تھیں لیکن
اپنی مجالس کو مخصوص دائرہ کے واسطے محدود کر دیا۔ حضرت سید الشہداء علیہ السلام سے جو لوگ واقف
نہ تھے یا کم واقفیت رکھتے تھے یا تجاہل عارفانہ کرنے کے عادی ہو گئے تھے ان کو شرکت کرنے۔
سننے اور سمجھنے کا موقع کم دیا گیا۔ اور اسی کا سبب ہے کہ آج مسلم حضرات کو مجالس عزا کی مخالفت
کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا اور انھوں نے اس مخالفت میں طرح طرح کے کام کئے گویا ہماری مجالس سالانہ
صدیوں سے برابر جاری رہنے کے باوجود اب تک "یادگار" کی حیثیت حاصل نہ کر سکیں جلسہ ہائے یادگار
نے دنیائے انسانیت سے بلا تفریق مذہب و ملت تسلیم کرا لیا کہ جلسہ ہائے یادگار حسینی واقعی یادگار رہ
ہینگے۔ آج تک دنیا کے پردے پر کسی "ہیرو" کی یادگار اگر اس صورت سے منائی گئی ہو تو تاریخ اپنے
صفحات کو پیش کر کے ہمارے دعوے کی رد کر دے۔ مذاہب عالم کے پیرو کسی نہ کسی بزرگ ہستی کو
اپنا ہیرو مانتے ہیں خود مسلمانوں میں پچاسوں فرقے ہیں اور ہر فرقہ کسی نہ کسی کو اپنا ہیرو تسلیم کرتا ہے
اور اس کی بزرگداشت کے واسطے ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کی یادگاریں مختلف عناوین اختیار
کرتا ہے۔ کوئی فرقہ اپنے بزرگ کی یادگار میں عمارت بنواتا ہے۔ کوئی پارک بنواتا ہے۔ کوئی شاہراہ، یا
اسٹریٹ بنواتا ہے کوئی کنواں بناتا ہے کوئی شفاخانہ مدرسہ یا کتب خانہ وغیرہ قایم کرتا ہے کوئی
اس ہیرو کا مجسمہ بنا کر کسی گزرگاہ عام پر یا کسی مشہور اور معروف مقام پر نصب کراتا ہے۔ کوئی یتیم خانہ
وغیرہ قایم کرتا ہے لیکن یہ تمام یادگاریں ایک مخصوص اور محدود طبقہ کے واسطے مفید اور دلچسپی کا سامان
فراہم کرنے والی ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہنومان بلڈنگ بمبئی۔ محمد علی پارک الہ آباد۔ کیننگ اسٹریٹ
لکھنؤ۔ جے جے ہاسپٹل بمبئی۔ D.A.V. کالج یا اسکول مقامات مختلفہ پر۔ ہارڈنگ لائبریری دہلی۔ ملکہ وکٹوریہ
کا بت مختلف مقامات پر مختلف شہروں کے یتیم خانے۔ گروکل کانگڑی وغیرہ۔ الہ آباد و دیگر مقامات
پر پاٹ شالہ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ سب چیزیں مختلف خصوصیات کی مالک ہیں لیکن ان میں سے مشکل
سے کسی ایک چیز کا اثر جس کو کسی خاص طبقہ نے بنایا یا قایم کیا ہو دوسرے طبقہ کے اشخاص پر ہوگا
اور یہ چیز بالکل فطری ہے اس میں چون و چرا کی گنجایش نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقے اپنے مشاہیر
کی یادگاریں خانقاہیں۔ مدرسے وغیرہ قایم کیے ہوئے ہیں اور مخصوص ایام میں وہاں سالانہ اجتماع
بھی ہوتا ہے اور ایک دن دو دن یا ایک ہفتہ دو ہفتہ خوب چہل پہل رہتی ہے لیکن کسی دوسرے طبقہ
کے اشخاص یا گروہ کو نہ کوئی دلچسپی ہوتی ہے نہ اس یادگار کا اثر عام ہے کچھ دنوں سے عزاداری حضرت

سید الشہدا علیہ السلام کو جو ایک یادگار کی صورت اختیار کر رہی تھی بعض ناعاقبت اندیش مسلمانوں
نے بند کرانے کی ناکام کوشش شروع کی جو سلسلہ اب تک جاری ہے۔ پہلے تو بذریعہ اشتہارات،
اخبارات، رسائل و تقاریر ذکر مصائب حضرت سید الشہدا کو روکنے، بند کرانے یا اس کے اثرات کو
محدود کرنے میں بعض نامی اشخاص میدان میں کود پڑے اور ان سب کو اس بات کی کد تھی کہ جس
طرح سے ہو عزاداری مظلوم کربلا کو ٹھیس لگ جائے۔ اس واسطے علاوہ متذکرہ بالا عنوانوں کے لکھنؤ
سے "مدح صحابہ" کے نام سے ایک تحریک شروع کی گئی جس کے نتائج اخبار بین حضرات سے پوشیدہ
نہیں۔ یہ مدح صحابہ حقیقتاً سیاسی اشخاص نے اپنا آلہ کار بنا کے ملک کے عرض و طول میں فساد برپا
کرنا شروع کیا اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اب اسی جماعت نے یہ قصد کیا ہے کہ جہاں جہاں پر
شیعہ اقلیت ہو وہاں کسی بزرگ صحابی کے نام سے کوئی دن مقرر کیا جائے اور جلسے کیے جائیں اور
رفتہ رفتہ وہی صورت پیدا کر دی جائے۔ جو لکھنؤ یا جونپور میں ہو چکی ہے چنانچہ بدایوں میں بھی اس قسم کی
ایک تحریک پیدا ہوئی۔ ہم نے وہ اشتہار نہیں دیکھا جس میں مولانا عبدالحامد صاحب مع دیگر حضرات
کے داعی بتلائے جاتے ہیں لیکن شہر میں خبر گرم تھی کہ "یوم صدیق" کی زبردست تیاریاں ہو رہی
ہیں بہر کیف ایک اشتہار جو غالباً پہلے اشتہار یا اعلان کے بعد شائع ہوا شہر میں چسپاں کیا گیا اور تقسیم بھی ہوا
جس میں ہر محلہ اور ہر طبقہ کے اہلسنت کے دستخط یا بے پڑھے لکھے حضرات کے انگوٹھے کے نشان تھے
اور یہ اعلان کیا تھا کہ "بدایوں کو لکھنؤ نہ بناؤ" اس اشتہار میں مولانا عبدالحامد صاحب سے اپیل کی گئی
تھی کہ وہ بدایوں کو لکھنؤ کا نمونہ نہ بنائیں۔ بعد کو یہ معلوم ہوا کہ کچھ اور پوسٹر بھی اس گروہ کی طرف سے
یا اس گروہ کی تائید کرنے والوں کی طرف سے شائع ہونے والے ہیں جس نے "یوم صدیق" کی تحریک
شروع کی تھی اور اس سلسلہ میں یہ کوشش کی گئی کہ بعض ناواقف معاملہ شیعہ حضرات سے یہ باور کرا کے
دستخط کرا لیے گئے کہ "یوم صدیق" سے یا اس قسم کی تحریک سے شیعوں کو اختلاف نہیں ہے۔ اس خبر کے
معلوم ہونے پر مولوی محمد اقتدار عالم صاحب ایڈووکیٹ نے ایک جلسہ میں صورت حال پیش کر کے
حاضرین سے خواہش کی کہ وہ جو کام کریں منظم حیثیت سے کریں انفرادی صورت میں کام کے خراب
ہو جانے اور مقصد کے فوت ہونے کا اندیشہ ہے حاضرین نے اس سے اتفاق کیا۔ ایک کاغذ پر
کچھ تحریر لکھی گئی جس کا منشا یہ تھا کہ "یوم صدیق" ایک جدید تحریک ہے اور اس سے آئندہ فساد کا
اندیشہ ہے اس لیے ہم دستخط کنندگان کو اختلاف ہے۔ خوش قسمتی سے یا بدقسمتی سے شیعیان بدایوں
باوجود قلیل التعداد ہونے کے ہمیشہ عام اسلامی معاملات میں پیش پیش رہتے ہیں اور دوسرے

قدم سے سنّی ہمیشہ ایسے اقدامات کرتے رہے ہیں جن سے امن عام برقرار رہے اور شہر میں کوئی فساد نہ ہو۔ اگر کبھی ہندو مسلم فساد ہوا جس نے خطرناک صورت اختیار کی تو اس میں شیعہ ہی سب سے آگے نظر آئے۔ چھوٹے واقعات کا تذکرہ تو بے محل ہے بدایوں کی تاریخ میں "حسینی گلی" سے متعلق واقعات جب تک یاد رہیں گے حضرت خال المعظم مولوی طفیل احمد صاحب مرحوم کا نام باقی رہے گا۔ جامع شمسی کا اب جو چاہے انتظام کرے لیکن اپنی گاڑھی کمائی کا ہزاروں روپیہ صرف کر کے اسی محترم ہستی نے جامع مسجد کی ایسی مرمت اور درستی کرادی جو صدیوں تک باقی رہے گی۔ میں شیعہ ہوں اور اس پر مجھے فخر بھی ہے لیکن میں ہرگز کسی سنّی بھائی کو مدح صحابہ کرتے ہوئے دیکھ کر نہ تنگ دل ہوا نہ احتمال ہے۔ اپنے ذاتی عقائد کے مدنظر ہر شخص اپنے محبوب کے اوصاف بیان کرنے کا حق رکھتا ہے اور مجھے اس سے اختلاف کا کوئی حق نہیں ہے۔ عام محافل میلاد شریف میں، جمعہ کے خطبہ میں مساجد میں خانقاہوں میں عرسوں کے موقع پر ہمیشہ مدح صحابہ ہوتی ہے اور ہوا کرے کسی شیعہ کو ناگوار نہیں ہو سکتا۔ میں خود ایسے جلسوں میں شریک ہوا ہوں جن میں نعت خوانوں نے اور مقررین نے مدح صحابہ کی اور میں کبھی کانوں میں انگلی دے کر وہاں سے نہ بھاگا لیکن کوئی ایسا جدید فعل جس سے احتمال نقض امن یا فساد ہو ہر با فہم انسان کو پسند نہ آئے گا۔ "یوم صدیق" کی توجیہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اگر یہ اسی روز منایا جا رہا ہے جو اس بزرگ صحابی کا یوم وفات تھا تو آج ۱۳ سو سال کے بعد یہ خیال کس بنا پر پیدا ہوا۔ گزشتہ ۱۳ صدیوں میں ملک کے عرض و طول میں کتنے "یوم صدیق" منائے گئے اور کس کس جگہ اور ان میں کیا عنوان رہا۔ اس تفصیل کے معلوم ہونے کے بعد ہم دوسرا بیان شائع کریں گے لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس سوال کا جواب انشاء اللہ تعالیٰ کچھ نہ آئے گا تو اب یہ یوم صدیق یقیناً کوئی ایسی تحریک سمجھا جائے گا جس کی تہ میں کوئی خاص شے پوشیدہ ہو۔ ورنہ اگر صرف اس قدر ہوتا کہ اس بزرگ صحابی کے یوم وفات پر ان کی روح مقدس کو ثواب پہنچانے کی غرض سے یہ اہتمام تھا تو مسجدوں میں قرآن خوانی محفلوں میں میلاد خوانی۔ خانقاہوں میں قوالی وغیرہ سے یہ غرض پوری ہو سکتی تھی اس سے نہ کسی سنی کو اندیشہ فساد ہو سکتا تھا نہ شیعہ کو اختلاف۔ مشاہیر اہل سنت بدایوں کا اختلاف اور پوسٹر شائع کرنا اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ کوئی شے در پردہ تھی۔ مولانا عبد الماجد صاحب ہمارے قدیم کرم فرما ہیں اور شیعہ روساء سے ان کے کافی تعلقات ہیں جن میں سرکار راجہ صاحب سلیم پور کا نام نامی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ مولانا سے ہمکو ہرگز ایسی امید نہ تھی نہ ہے کہ وہ مولوی عبد الشکور مدیر النجم کے داؤ میں آکر کوئی ایسا اقدام کریں گے جس سے فساد کا اندیشہ ہو۔ لوگ کہتے ہیں کہ مولوی

عبدالشکور نے یہ پروپاگنڈا کرایا ہے۔ ہمیں اس میں شبہ ہے۔ ہمیں اس کا افسوس ہے کہ مولانا عبدالحامد
صاحب کے اعلان یا اشتہار کے خلاف کوئی پوسٹر شایع کیا گیا لیکن ہمیں اس کا بھی صدمہ ہے کہ مولانا عبدالحامد صاحب
کا اعلان یا اشتہار کچھ ایسی صورت اختیار کیے ہوئے تھا کہ خود حضرات اہل سنت والجماعت اُس کے
مخالف ہوگئے اور انھوں نے اُس کو فساد آفریں سمجھا۔ ہمیں یہ معلوم کرکے بیحد حیرت ہوئی کہ بعض
ذمہ دار اہل سنت نے ایک با اثر شیعہ بزرگ سے یہ مطالبہ کیا کہ ہم نے یوم حسین میں آپ کی شرکت
کی ہے اب "یوم صدیق" میں ہماری شرکت کیوں نہیں کرتے اور اس سے آپ کو کیوں اختلاف ہے
اُن بزرگوار نے تو جو مناسب محل جواب سمجھ میں آیا دیا لیکن ہم اس موقع پر یہ کہے بغیر باز نہیں رہ سکتے
کہ اُس بزرگ نے یہ سوال کرنے کی ہمت کیوں کی "یوم حسین" اور "یوم صدیق" دو بالکل متضاد و بعید
چیزیں ہیں۔ حضرت ابوبکر میرے مورث اعلیٰ تھے کیونکہ میں حضرت محمد بن ابی بکر کی اولاد میں ہونے کا شرف
رکھتا ہوں لیکن میں اچھی طرح جانتا ہوں اور حقیقت ہے کہ حضرت ابوبکر سے کامل عقیدت رکھنے والا
سُنی بھی اُس بزرگوار کی مبارک زندگی کو تمام عالم انسانیت کے واسطے سبق آموز اور نمونہ نہیں سمجھتا بخلاف
اس کے شیعہ نہیں سنی نہیں بلکہ ہندو عیسائی۔ پارسی اور دنیا کی تمام دوسری قومیں حضرت سید الشہدا
کو کمال انسانیت کا نمونہ اور دنیائے انسانیت کے واسطے بہترین نمونہ تسلیم کرتے ہیں۔ یادگار حسینی کے جلسے جو اس
سال ملک کے عرض و طول میں ہو رہے ہیں انھوں نے ثابت کر دیا بلکہ دنیا سے تسلیم کرا لیا کہ حضرت سید الشہدا
علیہ السلام کی شخصیت مشاہیر عالم میں منفرد ہے۔ اب "حسین ڈے" کا تقابل کسی دوسرے ہیرو کے دن سے یقیناً
تاریخ سے ناواقفیت یا پردہ پوشی ہے۔ بمبئی کراچی اور اکثر دیگر مقامات کے جلسوں کی کارروائی انگریزی و
گجراتی اخبارات میں شایع ہوئے لیکن بعض مقامات کی تفصیلی کیفیت کسی اُردو اخبار میں شایع نہ ہونے کی
وجہ سے اُردو داں حضرات کو علم نہ ہو سکا کہ "یادگار حسینی" کے سلسلہ میں کیا ہوا اس لیے ذیل میں ہم چند جلسوں
کی کارروائی کا خلاصہ درج کریں گے جس سے ظاہر ہو سکے کہ "جلسہ ہائے یادگار" واقعی یادگار ہوئے۔ کاٹھیاواڑ
کے علاقہ میں ہندو ریاستوں کی کثرت ہے اور اگرچہ بعض ریاستیں مسلم روسا کے زیر نگیں ہیں لیکن افسوس کے ساتھ
کہنا پڑتا ہے کہ ان اسلامی ریاستوں میں نجدیت کا ایسا اثر تھا کہ وہاں جلسہ ہائے یادگار کی بنا علی الاعلان
صدر مقامات پر نہ ہو سکی اگرچہ چھوٹے چھوٹے مقامات پر جلسے ہوئے اور اپنی حد تک بہت کامیاب ہوئے
مختلف مذاہب کے نمائندے شریک ہوئے تقریریں کیں نظمیں پڑھیں اور حضرت سید الشہدا علیہ السلام کی
مقدس سیرت پر عمل پیرا ہونے کا حاضرین نے عہد کیا۔ کاٹھیاواڑ میں بھاؤنگر اور جام نگر کے جلسے واقعی
یادگار رہیں اور دہلی اور بمبئی کے جلسے سے زیادہ شاندار نہیں تو اُن کے لگ بھگ ضرور تھے۔ بھاؤنگر ایک

ہندو ریاست ہے اور یہاں کے رئیس اپنی ہردلعزیزی کے واسطے دور دور مشہور ہیں اس ریاست میں
صرف چند گھر اثنا عشری خوجہ حضرات کے ہیں جنھوں نے اپنی رواداری اور اخلاق کی بنا پر دوسری
قوموں کے دلوں میں گھر کر لیا ہے افسوس ہے کہ اس جگہ خوجہ جماعت میں قلت کے باوجود پارٹی بندی
ہے لیکن چند با اثر حضرات کی کوشش کا یہ نتیجہ تھا کہ ایسا شاندار جلسہ ہوا جو کاٹھیاواڑ کی تاریخ میں نظیر نہیں
رکھتا۔ ۲۶ر اور ۲۷ر فروری دو جلسے ہونا قرار پائے تھے جلسہ کی صدارت مسٹر ٹینی وزیر ریاست نے کی
تھی مختلف ریاستوں کے نمائندے شریک جلسہ تھے بمبئی کے رئیس التجار سیٹھ حاجی داؤد حاجی ناصر جے
پی مجسٹریٹ درجہ اول باوجود کمال مصروفیت کے تشریف لائے تھے آپ کا ایک بہت بڑا کارخانہ
کینوس شو فیکٹری (CANVAS SHOE FACTORY) اسی ریاست میں رہا ہے اور اب بھی اس کے آثار باقی رہ گئے ہیں
[illegible] مقامی حالات کی بنا پر ملتوی ہے۔ مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی زاد فضلہ حضرت قمر الو
اعظین مولانا ناصر علی حیدری مدظلہ حضرت ناصر الدین صاحب رشید قمرابی حیدرآبادی بھی مدعو تھے۔ ۲۰ فروری [illegible]
کو دس بجے تمام کے سیٹھ حاجی داؤد بھائی اور مولانا قمر الواعظین مدظلہ العالی وارد بھاؤنگر ہوئے اسٹیشن پر
تین ہزار ایک جماعت نے خیر مقدم کیا۔ معزز مہمانوں کو ہار پہنائے گئے اور بھاؤنگر کے اسٹیشن پر استقبال
کے واسطے ہزاروں اشخاص کا مجمع تھا سیٹھ صاحب تو سرکاری مہمان خانہ میں بدور است تشریف
لے گئے اور مولانا حیدری مدظلہ العالی جلوس کے ساتھ روانہ ہوئے اس قدر شاندار جلوس تھا کہ دیکھنے والے
دیر تک تعریف کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ اس قدر مجمع کثیر ہوا کہ راستہ بند ہو گیا۔ مولانا حیدری مدظلہ العالی
کو جلوس کے ختم سے قبل قیام گاہ پہنچا دیا گیا تاکہ آپ ضروریات سے فارغ ہو کر جلسے میں شرکت فرما سکیں
بعد مغرب جلسہ شروع ہوا۔ تحریک صدارت و تائید کے بعد مسٹر ٹینی کرسی صدارت پر آئے۔ کار روائی
جلسہ شروع ہوئی۔ تلاوت کلام پاک سے ابتدا ہوئی ہندو مسلم پارسی عیسائی حضرات نے مختصر تقریریں کیں
جن میں سے ہر ایک میں یہ ظاہر کیا گیا کہ حضرت سید الشہداء علیہ السلام تنہا مسلمانوں اور بالخصوص شیعہ
حضرات کے ہادی و رہبر نہیں ہیں بلکہ عالم انسانیت کے رہنما ہیں۔ آج کے جلسے میں حضرت قمر الواعظین
کی تقریر خصوصیت کے ساتھ ذکر کے قابل ہے۔ آپ نے فلسفہ مشاہیر پرستی پر مختصر تبصرہ فرماتے ہوئے مشاہیر عالم
کا تذکرہ کیا اور بیان کیا کہ ان محترم ہستیوں کو دنیا کی مختلف قومیں اپنا اپنا ہیرو اور راہنما تسلیم کرتی
ہیں۔ عیسائی حضرت عیسیٰ کو، یہود حضرت موسیٰ کو، بدھ مذہب والے مہاتما گوتم بدھ کو اور ہندوستان
کے رہنے والے مہاراج رامچندر جی شری مہادیو جی اور مہاراج ہرشچندر جی مہاراج کرشن جی دیگر بزرگ ہستیوں کو اپنا پیشوا تسلیم
کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ان سے منسوب کرنے میں بڑی عزت خیال کرتے ہیں۔ ان تمام مشاہیر کی

مقدس زندگیوں کے حالات مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ اپنے اپنے مقام پر سب یکتائے زمانہ گزرے ہیں لیکن اپنے زمانہ اور آئندہ زمانہ کی تمام نسلوں کے واسطے یہ سب یا ان میں سے کوئی ایک کامل نمونہ پیش نہیں کر سکتے آج دنیا کے تمام مرد و زن حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا مہاتما بدھ یا [illegible] جی یا مہاتما [illegible] جی وغیرہ کی مقدس زندگی کو اپنا دستور العمل زندگی بنا کر کامیابی سے دو چار نہیں ہو سکتے۔ بعض صرف جوانوں کے واسطے بعض صرف ادھیڑ عمر کے انسانوں کے واسطے نمونہ ہو سکتے ہیں لیکن بچوں۔ نوجوانوں مستورات اور عورتوں کے واسطے ان تمام مشاہیر کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں ہے۔ انسانیت کاملہ کا نمونہ اگر ہے تو کربلا کے میدان میں نظر آتا ہے۔ کمال انسانیت سچائی ہے۔
انسان خود اپنی ذات۔ اپنے ماحول اور اپنے خدا کے واسطے اگر راست بازی کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تو وہ انسان کامل کہے جانے کا مستحق ہو سکتا ہے کربلا کے میدان میں بچے۔ نوجوان۔ جوان۔ بوڑھے مرد اور عورتیں سچائی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے اور آج اگر وہ نمونہ دنیا کے سامنے نہ ہوتا تو سچائی کی انتہائی منزل تک پہونچنے کے واسطے کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔ اس سلسلہ میں اپنے مشاہیر عالم کے مسلمات کو پیش کیا اور ثابت کیا کہ حضرت سید الشہدا سچائی کے علمبردار اور اپنے کمالات میں متفرد تھے آپ نے فرمایا کہ یہ جلسہ یادگار صرف خوبصورت اور وسیع پنڈال کی حد تک ہے۔ اجتماع کی حد تک ہے۔ پر جوش نظموں اور زلزلہ افگن تقریروں کی حد تک ہے یا اس سے بالاتر کوئی اور شے ہے آپ نے فرمایا کہ در اصل جلسہ یادگار کا مفہوم صرف یہ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ہمارا جلسہ اس وقت جلسہ "یادگار حسینی" ہو سکے گا جب ہم کو یہ معلوم ہو کہ جس بزرگ ہستی کی یادگار منانے کے واسطے جمع ہوئے ہیں وہ کن کمالات کا مالک تھا اور ہم اس کے کمالات کے حاصل کرنے کی کوشش کر کے صحیح معنوں میں یادگار قائم کرنے والے بن سکتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا کمال بلکہ ان کے کمالات کی جان "حق و صداقت" تھی۔ آپ حق پر زندہ رہے اور حق پر جان دی اور دنیا کو سکھا دیا کہ سچائی کا پرستار قربان گاہ حق و صداقت پر اپنا تن من دھن بلکہ اہل و عیال ننگ و ناموس بھی قربان کرنے کو آمادہ رہتا ہے اور جب وقت آتا ہے تو سب کچھ قربان کر کے علمبردار حق و صداقت ثابت ہو جاتا ہے۔ اس تقریر کا جو اثر ہوا وہ حاضرین بزم ہی خوب جانتے ہیں لیکن اس سے فی الجملہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ صدر جلسہ مسٹر پینی نے جو ہندو تھے ابھی آخری تقریر میں حضرت قمر الواعظین کی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے حاضرین سے خواہش کی کہ وہ فاضل مقرر کی تقریر سے اگر متاثر ہوئے ہیں تو جناب سید الشہدا علیہ السلام کے نقش قدم پر چل کر کامیابی سے دو چار ہوں اپنے حاضرین سے استفسار کیا کہ ہر مجمع میں

کس قدر اخلاص ہیں۔ جو حضرت امام حسین علیہ السلام کی زندگی کو نمونہ قرار دے کر ان کے راستہ پر چلنے کا عہد کرتے ہیں جو عہد کرنا چاہتے ہیں وہ ہاتھ اٹھا دیں۔ درحقیقت وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا کہ ۲۵-۳۰ ہزار کے مجمع نے بلا اختلاف ہاتھ اٹھا دیئے اور حسینیت زندہ باد کے نعرے لگائے گئے۔ دوسرے دن یعنی حسب نظام العمل بعد مغرب جلسہ شروع ہوا۔ کل کی تقریر کا یہ اثر ہوا کہ دربار بھاؤنگر کے چند معزز حکام ایک مجمع کثیر کے ساتھ حضرت قمر الواعظین کی آمد کا انتظار جلسہ گاہ کے پھاٹک پر کر رہے تھے انکی تشریف لانے پر مشاہیر نے اظہار کیا کہ کل کی تقریر کا ہمارے قلوب پر یہ اثر ہوا ہے کہ ہم آپکا خیر مقدم کرنے کے واسطے دیر سے اس جگہ جمع ہیں۔ آج کے جلسہ میں مہاراجہ بہادر بھاؤنگر نے بھی شرکت فرمائی بہت سی تقریریں ہوئیں نظمیں پڑھی گئیں۔ جن میں واقف صاحب بمبئی والے بہت کامیاب رہے۔ حضرت قمر الواعظین کو آج چند مرتبہ اسٹیج پر آنا پڑا اور مہاراجہ کے آنے کے بعد آپ نے مختصر تقریر انگریزی میں اسلام پر کی جس کو سارے مجمع نے پسند کیا اور اسلام کا سچا علم بردار حضرت سید الشہدا علیہ السلام کو دلائل اور براہین و مسلمات غیر مسلمین سے ثابت کیا۔ ختم جلسہ پر آپ نے مہاراجہ بہادر سے روانگی کے وقت خواہش کی کہ وہ چند کلمے اپنے اظہار پسندیدگی کے (اگر ان کو پسند آیا ہو) فرما دیں وہ کچھ متامل ہو گئے اور حضرت خواجہ حسن نظامی و مسٹر ٹینی نے فرمایا کہ مہاراجہ بہادر کا شریک جلسہ ہونا آپ کی پسندیدگی کا اظہار ہے اس کو کافی سمجھا گیا اور جلسہ بخیر و خوبی برخاست ہوا۔

حضرت خواجہ صاحب نے دونوں دن چند بار تقریر فرمائی اور مسئلہ خلافت پر کافی روشنی ڈالی مسٹر ٹینی کی صدارتی و آخری تقریر نہایت مفید اور برمحل ثابت ہوئی۔ مولانا رشید ترابی ناسازی مزاج کی وجہ سے شریک نہ ہو سکے۔ پنڈال نہایت شاندار اور خوشنما تھا۔ متعدد فوٹو لیئے گئے۔ حضرت قمر الواعظین نے ان تقاریر کے علاوہ ایک بڑے مجمع میں مجلس بھی پڑھی جو بہت مقبول ہوئی۔ باہر سے آنے والے مہمانوں کی تعداد [illegible] زیادہ تھی۔ وہ لوگ جو باہر سے غیر مسلم آئے تھے اور مہمان ہوئے تھے اُن کی تعداد بھی ہزاروں تک پہونچی مستورات کے واسطے پردہ کا انتظام تھا مہمانداری کا انتظام بہترین پیمانہ پر تھا اس واسطے علاوہ دیگر کام کرنے والوں کے خاص طور پر مسٹر محمد بھائی رفاہ علی بھائی مسٹر محمد علی نور محمد سیٹھ قاسم بھائی صبری بھائی خاص طور پر قابل ذکر ہیں خصوصاً جناب لوجی علی غلام علی صاحب مدیر راہ نجات علی محمد صاحب ترتیب مہمانداری کا انتظام بکا اثر مولوی عبدالشکور اور ان کے ہمنوا دیکھتے کہ حضرت امام عالی مقام کے ساتھ ہندو کس خلوص اور عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ (باقی آئندہ)

جن حضرات نے خطوں کا جواب نہیں دیا ہے وہ توجہ فرماویں انتظار ہے۔

از

(جناب سید العلماء مدظلہ العالی)

(گزشتہ سے پیوستہ)

ہماری سب سے پہلی مصیبت!

ہم دونوں بھائی مہر و محبت کی ایک بے پایاں فضا میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ دفعتاً ہمارے جد بزرگوار حضرت محمد مصطفےٰ بیمار ہو گئے۔ میرا سن اگرچہ اس وقت کم تھا لیکن میں بھی اتنا اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ نانا کی بیماری کے زمانے ہی سے ہمارے لیے فضا ناخوش گوار پیدا ہونے لگی۔ ہمارے نانا برابر زبانی اپنے اہل بیت کیلیے تمام مسلمانوں کو وصیت کرتے رہتے تھے آپ نے اپنی بیماری کے زمانہ میں چاہا کہ اس وصیت کو تحریری صورت سے مکمل کر دیں مگر لوگوں نے آپ کو اس مقصد میں کامیاب نہ ہونے دیا اور تحریر لکھنے نہ دی۔ ہم کو اس وقت ہی واقعہ یہ سمجھا دینے کیلیے کافی تھا کہ فضا کیا ہے اور صورت حال کیا ہونے والی ہے؟

میرے نانا کے بعد

جد بزرگوار حضرت محمد مصطفےٰ کی وفات کے بعد میرے باپ علی مرتضیٰ اور مادر گرامی فاطمہ زہرا کو بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں انتہا یہ ہے کہ میری ماں یہ شعر پڑھتی تھیں۔

صبت علیّ مصائب لو انھا   صبت علی الایام صرن لیالیا

یعنی میرے اوپر اتنی مصیبتیں پڑیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو شب تار ہو جاتے۔

آخر میری والدہ نے اسی حسرت و الم اور غم و یاس کے عالم میں دنیا سے سفر کیا۔

یہ میرے لیے دوسری مصیبت تھی

میرے والد بزرگوار کی طرف عام افراد کی جتنی توجہ دختر رسولؐ کی حیات میں تھی اتنی بھی بعد کو

باقی نہیں رہی۔ یقیناً اگر میرے والد اس وقت اس مذہب اسلام کے مفاد کو ملحوظ نہ رکھتے جس کے لیے آپ رسول کی زندگی میں اپنا خون پسینہ ایک کر چکے تھے تو اس وقت مسلمانوں میں ایک بہت بڑی خانہ جنگی برپا ہو جاتی۔ مگر میرے پدر بزرگوار نے دنیاوی سلطنت کی طرف سے بالکل بے رخی اور بے توجہی سے کام لیا۔ آپ نے اپنے حقوق کے زبانی اظہار پر اکتفا کر کے عملی مخالفت سے علیحدگی اختیار کی اور اس طرح اسلام کو ایک بڑی بربادی سے بچا لیا۔

یہ پہلا سبق تھا جو مجھے حاصل ہوا اور جو میرے لیے سلطنت دنیا سے بے اعتنائی کے لیے ایک بڑا نمونہ تھا۔

تین دور اسی طرح گزر گئے۔ چوتھی مرتبہ لوگوں نے میرے والد علی مرتضیٰ کو مجبور کیا کہ وہ حکومت کی ذمہ داریوں کو اپنے متعلق کریں۔ میں نے دیکھا کہ وہ جناب باوجود اس بات کے کہ اس کے پہلے ہمیشہ اپنے حق کا اعلان کرتے رہے تھے اس وقت باوجود لوگوں کے اصرار کے انتہائی انکار کر رہے تھے اور کسی طرح تیار نہ تھے، اس کا باعث یقیناً یہ تھا کہ اس وقت مسلمانوں کی عادتیں بگڑ چکی تھیں اور خلافت کے بارے میں زاویۂ نگاہ ہی میں تبدیلی ہو گئی تھی خلافت رسول بالکل حکومت دنیا اور سلطنت کے قالب میں ڈھل گئی تھی اور کسرویت و قیصریت کے آثار اس میں نمودار ہو گئے تھے۔ یہ چیز کسی طرح اس سادگی بے تصنعی کے ساتھ سازگار نہ تھی جسے دنیا میں میرے نانا نے پھیلایا تھا اور جس پر میرے باپ قائم تھے اسی کا نتیجہ تھا کہ میں نے دیکھا جب انتہائی اور حد سے گزرے ہوئے اصرار پر میرے والد تخت سلطنت پر بیٹھے تو دنیا آپ کے احکام کی پابندی اور آپ کی تعلیمات کی پیروی کے قابل ثابت نہیں ہوئی آپ کی مخالفت کا طوفان برپا ہو گیا۔ جمل اور صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں اور آخر مسجد میں حالت نماز میں آپ کے سر پر زہر آلود تلوار لگائی گئی اور آپ دنیا سے رخصت ہوئے۔

یہ بڑا تلخ تجربہ تھا جو مجھے عینی مشاہدہ کی صورت میں حکومت و سلطنت سے متنفر بنانے کے لیے کافی ہوا۔

شام کی سلطنت پر میرے پورے خاندان بنی ہاشم کے دشمن بنی امیہ کا قبضہ تھا اسی خاندان کا ایک شخص معاویہ بن ابوسفیان دمشق کے تخت پر فرمانروا تھا۔ اسی خاندان کے ہاتھوں میرے نانا کو بہت تکلیفیں اٹھانا پڑی تھیں۔ اس معاویہ کی ماں ہندہ وہ تھی جس نے رسول کے چچا حمزہ کی لاش پامال کرائی تھی اور ان کا جگر منہ میں لیکر چبانا چاہا تھا۔ میرے والد سے بھی معاویہ برسرپیکار رہا تھا۔ میرے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد میرے بڑے بھائی حسن مجتبیٰ سردار خلق ہوئے۔ حسن نے دیکھا کہ نتیجہ

خونریزی کے ساتھ بھی حالات کے اصلاح کی کوئی صورت نہیں ہے اس لیے آپ نے مخصوص شرائط کے ساتھ امیر شام کے ساتھ مصالحت کرلینا پسند کیا۔

ان شرائط مصالحت میں سب سے اہم شرط یہ تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی دوسرے شخص کو خلافت کیلیے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا بلکہ خلافت پھر بنی ہاشم کی طرف واپس آئے گی۔

اس صلح کے ساتھ مجھے بھی پورا اتفاق تھا۔ ہمارے جد بزرگوار اور ہمارے نانا کی تعلیم یہی تھی کہ جب تک حمایت باطل کی ذمہ داری اپنے اوپر نہ آتی ہو اس وقت تک صلح کو جنگ پر ترجیح حاصل ہے اور رواداری سے کام لینا مناسب ہے۔

ہمارے نانا نے "حدیبیہ" میں کفار قریش کے ساتھ اسی اصول پر صلح کی اور ہمارے والد بزرگوار نے صفین میں اہل شام کے ساتھ مصالحت اختیار کی۔ یہی اصول بھائی حسنؑ کے پیش نظر تھا مگر ہم نے دیکھا کہ اس کے بعد بھی میرے بھائی امام حسن کو اطمینانی زندگی بسر کرنے نہیں دی گئی اور آخر ایک مخفی سازش کے ساتھ زہر دلوا کر ان کی زندگی کو ختم کر دیا گیا مگر اس کے بعد بھی جب تک کہ کوئی واضح سبب نہ ہوتا مجھے کسی اقدام کا موقع نہ تھا۔ چنانچہ اس کے بعد دس برس تک میں بالکل خاموش رہا۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ جوانی کا دور جو عام انسانی حیثیت سے جوش اور ولولہ کا عہد ہوتا ہے جس میں انسانی افعال زیادہ تر ہنگامی جذبات کے ماتحت ظاہر ہوتے ہیں یہ پورا دور میرا اس خاموش اور پُرامن فضا میں گذرا جو میرے والد علی بن ابی طالب کو ان کی گوشہ نشینی کے دور میں حاصل تھی۔

میری طبیعت میں صبر اور تحمل، ناگوار مشکلات کا برداشت کرنا بالکل راسخ ہوگیا تھا۔ اگر امام حسنؑ کی صلح میرے مذاق طبیعت کے خلاف ہوتی یا ان کے دباؤ سے میں نے اس صورت کو گوارا کیا ہوتا تو ان کی وفات کے بعد کافی موقع تھا کہ میں حالات میں انقلاب پیدا کرتا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا اور دس برس کی طویل مدت اس کے بعد بھی گزار دی۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ میری عمر ساٹھ برس کے قریب پہونچ چکی تھی اور یہ دور کسی جوش و خروش اور امنگ و ولولہ کا نہیں ہوتا۔ تم کو یہ سمجھنے کا حق حاصل ہے کہ مجھے حکومت وسلطنت کی کوئی ہوس تھی جبکہ میری سابقہ زندگی کے خود حالات اور میری نفسی ساخت کی شہادت اس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔

(باقی آئندہ)

جن حضرات کے ذمہ بقایا بروقت چلی آتی ہے وہ فوراً توجہ فرمائیں جنھوں نے رقوم بھیجدی ہیں اُن کا شکریہ۔ (منیجر)

واقعۂ کربلا

اور

اُس کے اسباب و نتائج

از

علامہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیب ایم اے صدر شعبۂ فارسی
(لکھنؤ یونیورسٹی)

گاہ گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را　　　تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

عرب میں قریش کا قبیلہ اپنی شرافت کے اعتبار سے نہایت ممتاز تھا کعبہ جو اسلام سے مدتوں پہلے بھی عرب کا سب سے بڑا عبادت خانہ اور مذہبیت اور تقدس کا سب سے بڑا مرکز تھا اس کی مجاوری کا فخر بھی اسی قبیلے کو حاصل تھا۔ اپنی مخصوص فضیلتوں کی بدولت یہ قبیلہ ایک مدت تک عزت کی قلمرو پر فرمانروائی کرتا رہا۔ آخر زمانے کی نظر لگ گئی، اور حسد نے پھوٹ کا بیج بو دیا۔ جب حضرت ہاشم کعبہ کے مجاور ہوئے اور اُن کی خدمتوں نے ان کو تمام عرب کا مخدوم بنا دیا تو اُن کا عروج و وقار ان کے بھتیجے اُمیّہ کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا۔ اہل حسد کی اس زمانہ میں بھی کمی نہ تھی، اُمیہ نے انھیں کی مدد سے کوشش کی کہ عزت و سرداری کا تاج حضرت ہاشم کے سر سے اُتار لے مگر ناکامیوں نے مخالفت کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ تاہم دلوں میں یہ آگ سلگتی رہی۔

ہاشم کے بعد ان کے بیٹے عبدالمطلب اور پوتے ابوطالب خانہ کعبہ کے مجاور رہے۔ ہاشم کے عادات و اطوار ان کو ورثہ میں ملے تھے۔ انھوں نے بھی اس خدمت سے عظمت حاصل کی۔ اُمیہ اور اس کے بیٹے حرب نے ان دونوں کو بھی عزت کی مسند سے اُتارنا چاہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ حسد اور عداوت کی جڑیں اور مضبوط ہوگئیں۔

جب ہاشم کے پرپوتے حضرت محمدؐ نے اپنی پیغمبری کا اعلان کر کے بت پرستی کی مخالفت اور وحدانیت کی تلقین شروع کی تو بنی اُمیّہ کو بڑا اندیشہ ہوا کہ اگر کہیں لوگوں نے حضرت محمدؐ کو خدا کا رسول اور اُن کے

سلام

(جناب سید ہاشم حسین صاحب ضو لکھنوی مقیم حیدرآباد)

[illegible] گر سب نشاں دیکھا کیے
شہ تصور میں نہ جانے کیا سماں دیکھا کیے

تشنہ بیں مسلم جو کوثر کا سماں دیکھا کیے
یوں لہو دوڑا کہ مٹتے جھریاں دیکھا کیے

نہر پہ عباس جب پہنچے تو چھپ چھپ کر لعیں
شیر کو لیتے ہوئے انگڑائیاں دیکھا کیے

ناصرانِ شاہِ دیں کٹتے تھے کیا حق میں نظر
کربلا کے ذرے ذرے میں جناں دیکھا کیے

حلق میں اصغر کے ٹپکاتے نہ تھا اتنا بھی آب
ہائے سب جھولے میں لیتے ہچکیاں دیکھا کیے

انتہائے صبر و استقلال و عزمِ شہ یہ تھا
خاک میں ملتے شباب نوجواں دیکھا کیے!

کیوں خلیل اللہ کہیے آپ سرور کی طرح
لختِ دل کو یوں رگڑتے ایڑیاں دیکھا کیے؟

ہو چکیں جب صبر کی طے ارتقائی منزلیں
شاہِ دیں مشکل میں بھی آسانیاں دیکھا کیے

دل پہ کیا گزری خدا جانے مگر بیکس حسین
گود میں اصغر کو لیتے ہچکیاں دیکھا کیے

جب چلے سرور تو چشمِ یاس سے اہلِ وطن
کارواں کے بعد گردِ کارواں دیکھا کیے

کربلا میں حضرت ایوبؑ و یعقوبؑ و خلیل
شہ کا استقلال وقتِ امتحاں دیکھا کیے

نزع میں بالیں پہ ضو کی تھے جدھر مشکل کشا
اقربا اُس سمت پھرتے پتلیاں دیکھا کیے

سلام

(نواب محمد معین خاں صاحب نسیم)

نہ ہوتا بچہ بچہ قتل رن میں شہ [illegible] داں کا
تو پھر کیوں کر نکھرتا رنگ احمد کے گلستاں کا

زبانِ کلک سے نقشہ کھینچے کس طرح زنداں کا
وہ تنہائی حرم کی اور وہ منظر یاس و حرماں کا

حمیت کوفیوں میں تھی نہ تھا کچھ پاس ایماں کا
بہا پایا جو ضیافت کے عوض خون اپنے مہماں کا

علی وہ بابِ شہرِ علم و حکمت ہے زمانے میں
ہے طفلِ مکتب اک روح الامیں جس کے دبستاں کا

عزیزوں کی طرح سے حر کو آلِ مصطفےٰ روئے
نثارِ شاہِ والا ہو کے پایا رتبہ سلماں کا

لبِ دریا لڑے عباسِ غازی یوں ہزاروں سے
نظر میں پھر گیا نقشہ جہادِ شاہِ مرداں کا

عمل چاہیے سنتِ مصطفیٰ پر — نگاہ مودت ہے مرتضیٰ پر
عقیدت ہے دل میں خیر النساء کی
بڑی شان ہے عترتِ مصطفیٰ کی
ہدایت انہیں سے نبوت انہیں سے — رسالت انہیں سے امامت انہیں سے
شریعت انہیں سے طریقت انہیں سے — نری معرفت کیا حقیقت انہیں سے
یہ ہیں پیشوا باخدا بھی یہی ہیں
سفینہ بھی یہ نا خدا بھی یہی ہیں

خدا کی پروردگاری

از قلم
(محمد عنایت اللہ روشن بدایونی)

بندہ پرور ہے عجب پروردگار — صدقے قربان اس کی قدرت کے نثار
سب کو دیتا ہے بڑا داتا ہے وہ — غیب سے ہر روز پہونچاتا ہے وہ
بیکسی میں یار وہ کس کا نہیں — اس کا حامی ہے کوئی جس کا نہیں
کیوں نہ بگڑوں کو بنائے کارساز — ذات اس کی ہے غنی وہ بے نیاز
جس کو چاہے مرتبے والا کرے — پل میں ہر ادنے کو وہ اعلےٰ کرے
زیرِ فرماں صاحبانِ تاج ہیں — اس کے درویش و غنی محتاج ہیں
حق تو یوں ہے وہ نہ جس کا یار ہو — مفلس و بیکس و ذلیل و خوار ہو
جس کو چاہے دولت کونین دے — دائما دونوں جہاں میں چین دے
ہر نفس واجب ہے شکر اس کا کرے — قہر سے اللہ کے ہر دم ڈرے
رزق سب کو عمر بھر دیتا ہے وہ — دکھ میں دکھیوں کی خبر لیتا ہے وہ

روشن اس کی مرحمت درکار ہے
مہرباں وہ ہو تو بیڑا پار ہے

type of the complex idea of the events at Karbala. The result will vary in different cases but the truth of what has been said will be recognised and appreciated. For instance in some cases there will be a similarity of congruity (or a recognition of those very events) as in the couplet quoted last of all. In others will be found similarity of quality (or ideas in one set of circumstances transplanted in another set) as in the couplet:—

Zor hi kea tha jafa-i-baghban dekha keay,
Ashyan ujra kiya ham natawan dakha keay.

In others, still similarity of relation (analogy, parallels, metaphors) as in the couplet:—

Sar ta ba qadam surat-i-gul zakhm hun lekin,
Surat se numayan hai asar josh-i-tarab ka.

and in many more, associations inexplicable but fixed and indissoluble so that we feel that somehow or other the event of Karbala must have secretly crept into the knowledge of the poet and got reflected in his work as

Pardae raz-i-mohabbat ki koi had bhi hai,
Zinda chunwa diya ushshaqko diwaron men.

The theory is no vain philosophy. It has a definite meaning, a foundation on evidence and consistency with experience. It is a matter full of solid advantages Poets have been borrowing matters unconsciously from these events. This will convince them of the necessity of reading the history of events for if the theory of action and reaction of the outer and inner world be true in the production of ideas, a thorough knowledge of this historic event is necessary for the production of the choicest ideas and specially those of a moral nature. The knowledge will further make this kind of peotry methodical avoid confusion and ensure regularity and progress. The benefit which this attempt is expected to impart to morality is not the subject-matter of this heading; so it has been reserved for future discussions.

It would be a folly not to admit that the attempt of this exposition is crude and wanting in many respects partly owing to a desire to keep it within the scope of a magazine and partly owing to the limitation of the writer, but should this attempt succeed in awakening the interest of abler men who can do full justice to the subject, the writer shall consider himself amply repaid. (*Mumtaz Husain.*)

Translation. The heart since it has seen thy lovers struggling with death in thy path, has come to regard it as Karbala.

The severest case of the test of perseverence known to the poet was that of the martyrs at Karbala, hence the simile.

At the outset, the idea formed by the mind of the connection of these couplets with the event of Karbala will be vague. This agrees with the law that mental growth is not from the particular to the general but from the obscure to the clear. In solving the question how to get a clear idea of what is wanted to be known in such cases, it has to be remembered that poems like all other ideas are effusions of one's own conclusions and are experiences with acquired knowledge. If feeling were left aside the extent of whose determining effect in the moulding and producing of a thought is uncertain owing to (1) its independent variation and (2) its power at times to submerge the other elements the product will consist of acquisition of memory and personal additional ideation. The experiment of tracing back former which alone concerns this attempt to its source will require a double process viz., of anslysis and of synthesis to spot out the grain of knowledge sought to be ascertained. The poems will therefore have to be broken up into facts arranged according to the elements of which they are composed, according to the mode in which they have found expression and according to resemblances and differences to the alleged fountain head of knowledge. These divisions should not be expected and must not be taken as too absolute or absolutely final. Here in order to solve more or less satisfactorily the complexity of conditions affecting the process of development of various ideas, supplemental aid will have to be employed which consists chiefly of (1) ancient literature to determine as in the case of the note on couplet no. 2. above 'khak apni sabha bankegai dast-i-yar men,
Shukr-i-Khuda ke ham bhi ab aie shumar men.

that similar ideas did not exist previous to the Karbala event (ii) history and mythology available to the nation to see that there were no other events to give rise to similar ideas as has been done in several of the couplets quoted above and (iii) Race Psychology speeially with reference to language. Works of various authors should then be compared to find out and eliminate what is peculiar to them. The result of the observation must then be carefully arranged i. e put into proper places and stated methodically. This will give a basis for regarding all such ideas as merely different expression of one fundamental

Translation.

The dust of my body was used for making the rosary which eventually reached the hand of the beloved. Thanks be to God I have also been taken into account.

So for as ancient history can throw light the use of rosary was in vogue long before the Karbala event. The Christians, the Zoroastrian, fireworshippers and the Hindus all used it under different denominations but these were made of seeds of plants of wood beads and of various other materials other than clay The rosary of clay made in a peculiar way was introduced just after the event of Karbala. It was and is still made out of earth of Karbala as a mark of reverence for the very earth on which the blood of the martyrs of Karbala was shed. This idea of consecrating the very dust of the place where the remains of a true lover are deposited by utilising it for making a rosary to be used by the beloved, could hardly have come into existence in poetry but for the event of Karbala and the subsequent introduction of rosaries of the clay of that place. It would be interesting to note that whereas instances of more or less similar ideas may be given from poetry written subsequently to the death of Husain, no such instances are found in the literature of the period before his assasination. This verse strongly demonstrates the theory advanced and admits of no rebuttal. Illustraations may easily be multiplied but for want of space only one more quotation is made out of the poems of a gread Hindu poet Raja Jaswant Singh Parwana, son of Maharaja Beni Bahadur Singh a courtier of Nawab Shuja-ud-Daulah of Bengal, who lived in Bengal in 1751 A. D

Taraptey jo dekhi hain lashen to dil ab.
Tere kuchey ko Karbala janta hai.

تڑپتے جو دیکھی ہیں لاشیں تو دل اب۔
تیرے کوچے کو کربلا جانتا ہے۔

such earnest mourners. The mourners carried a banner to denote (figuratively) the power under which the lover fought to make a way for himself but died in the struggle. It is an accepted fact that the greater the congregation attending a banner of mourning and the louder the din caused by the beating of the breast, the greater is considered to be the impressiveness of the scene–hence the poet's Eulogy of the ceremony.

In this couplet there can not possibly be two opinions as to the source from which the idea has been developed.

To commemorate the struggle at Karbala it is the custom among the followers and, admirers of Husain to raise banners representing the banner used at Karbala under which Husain and his followers fought to death in support of righteousness, though they were sure that they could not accomplish at the time what they wanted and were equally sure that they must perish as a result of fighting against tremendous odds. The mourners beat their breast as an expression of intense sorrow at the helplessness of Husain, the sancty recognition of his noble cause and at their misfortune in coming into existence too late to be able to rally round Husain's banner. The beating of breast in accompaniment with banners as an expression of intense sorrow, inadequate recognition of the sacrifices made by an earnest lover (of truth) and his perseverence in righteousness is a ceremony peculiar to the commemoration of Husain's fight. The poet has applied it to the life of lovers; and evidently with great propriety.

Another poet Mirza Dabir who is now dead, says in one of his Ghazals:—

Khak apni sabha banke gai dast–i–yar men,
Shukhr–i–khuda ke ham bhi ab aie shumar men

خاک اپنی سبحہ بن کے گئی دست یار میں۔
شکر خدا کہ ہم بھی اب آئے شمار میں۔

in love, or it may be love itself, leaves indelible mark on all that comes in touch with it and that its traces may be seen even after lapse of ages. History records no other event except that related above whence this fine idea could be derived; and the said event is so well known, being related every year in Moharram, that the resemblance can hardly be accidental. Now I will give a few instances from the writings of the dead poets, Maulana Room, that great poet of the East says:—

Ek Husain-i-nist ku gardad shahid,
Warna bisyar and dar alam **yazid.**

یک حسینے نیست کو گرد د، شہید-
ورنہ بسیار اند در عالم یزید-

Translation.

There is none to die a martyr's death like Husain, otherwise there is no lack of Yazids (who sent the expedition against Husain) in the world. The meaning which the author wants to convey is clear to those who have read the history of Islam and the connotation or reference

The late Hakim Momin of Delhi, the greatest poet of his time, who belonged to the Sunni sect says in one of his Ghazals:-
Sina kobi se zamin sari hila ke uthey,
Keya alam dhum se terey Shuhada ke uthey.

سینہ کوبی سے زمین ساری ہلا کے اٹھے-
کیا علم دھوم سے تیرے شہدا کے اٹھے-

Translation.

The mourners of thy banners shook the earth with the beating of the breast, How impressive was the banner in which thy martyrs were carried.

The sincerity of the lovers gave birth to zealous mourners whose feelings found vent in the beating of their breast. On account of the intensity of the feeling, the beating was so violent that the din shook the earth. The poet wants to convey the idea of the sincerity of the lover from his death producing

route other than the highway. They had to pass through plains covered with thorns. Abid had to walk ahead of the row. He was sick and fettered in chains From time to time during the journey he became so exhausted that fatigue and feebleness compelled him to lie down on thorns themselves. But for this occurrence the poet should have found it very difficult, if not impossible to find a simile for the Prophet's eye considering the purity of reverence with which the Musa'mans regard every thing connected with their Prophet.

The ladies and children of Husain when carried after his murder to the presence of Yazid in his court, were bound with a cord. The cord was too small for binding the number of persons so taken. The prisoners were therefore kept close to one another and the cords were drawn tight. The result was the bleeding of arms in several cases. Now it is usual in Urdu poetry to describe a beloved exhibiting all sorts of cruelty to the lover for no other crime but that of loving which itself is an act severely punishable in the eyes of the beloved. Every conceivable infliction of a torment from the beloved is at once accepted as a proper and suitable subject for a poet's delineation. The lover on the other hand is represented as submitting to all sorts of iniquities. Pinioning the lover by way of punishment for his love is an idea which according to its accepted canons, finds currency in poetry. The poet drawing his idea from the facts just narrated, says:—

Jismen kabhi bandhe the saudaiyan-i-ulfat,
Abtak nishan lahu ka us risman men hai.

جسمیں کبھی بندھے تھے سودائیان الفت۔
اب تک نشان لہو کا اس ریسمان میں ہے۔

Translation.

The cord with which lovers were tied in time long past, still bears the mark of blood on it.

What the poet wants to impress by the episode of "cord and pinioning" is that truth, in this instance finding expression

This idea again owes its origin to the condition of Husain just before his death when he was reeling on the back of his horse from hundreds of wounds inflicted on him from head to foot. He was nevertheless happy at having fulfilled his mission of upholding the truth. History confirms the tradition that Husain died with a smiling face. The following couplet has an original smile taken directly from the event.

Nazar yon chashm-i-mahbub-i khuda ati thi mizgan men,
Safi kanton pe goya Abid-i-bimar baithe hain.

نظر یوں چشم محبوب خدا آتی تھی مژگاں میں-
صفی کانٹوں پہ گویا عابد بیمار بیٹھے ہیں-

Safi, the eyes of the prophet surrounded with eye-lashes, reminded one of Abid the sick sitting amid thorns Abid was a great-grand son of the Prophet. A child or grand-child is addressed in eastern epistolary writing as (Quratul-Ain) delight of the eye. Also in the east, a languid eye is compared to a sick person. Abid's sickness at Karbala is proverbial and has been given peculiar prominence in the Muslim tradition. Hence the poet has drawn comparison between the eyes of the Prophet and Abid. And as of all the temporal successors of Prophet, Abid was the most devoted to prayers, his name always carries with it a suggestion of piety and purity which also the poet means to convey when speaking of the expression of the Prophet's eye.

To make clear the smile of eye lashes and thorns it is necessary to relate Abid's position among the relations of Husain when after the latter's death, they became captives. Abid was the only adult male among them. He was given the duty of driving the row of camels carrying the captives. As yet orders were not received from Yazid (the Caliph who had sent the expedition against Husain) as to whether the prisoners were to be taken to his court openly or with secrecy. The men on the spot therefore decided to send the carvan by a

Translation:-

Having no power of resistance there was nothing for me but to submit to the oppression of the gardener. While my nest was being destroyed I looked on in utter helplessness.

The poet's idea apparently relates to a certain episode of the garden where a helpless bird was the witness of the tragedy. But he has admitted that at the time of composing it, he had before his mind's eye the scene of that historic occasion when after the brutal assasination of Husain, his property was looted, his tents were set on fire and his children were ill treated. The only living male member of the family was Ali (known as Sajjad and Abid) the son of Husain who was too ill and feeble to offer any resistance. He had to see what happened but had no power to resist.

The poet was deeply impressed with this event and at the time of composing his ghazal changed the scene of occurrence, put the words into the mouth of a bird and produced a couplet full of pathos. Had not the poet himself verified the fact it would have been difficult to convince a man, not iu close touch with Mohammedan literature, of the idea having been culled from the event of Karbala.

In another couplet of another ghazal similarly verified to have been drawn from the same source, the poet says:-

Sar ta ba qadam surat-i-gul zakhm hun lekin,
Chihre se numayan hai asar josh-i-tarab ka.

سرتا بقدم صورت گل زخم ہوں لیکن-
چہرہ سے نمایاں ہے اثر جوش طرب کا

Translation.

My very countenance will show the unmeasured ardency of my transport (at receiving the wounds from the hands of the beloved) though I look like rose itself from the wounds (on account of accompanying associations as pleasing to mind and on account of resemblance as appealing to sight, as a rose which cover me from head to foot.

and all that resulted from it for centuries afterwards, with all its results appearing centuries ago, present a mine of all possible and similar ideas which can be fitted to the case of an individual A great deal of knowledge is acquired from them indirectly and when they are found consistent with one's direct knowledge which has sprung from one's own experience though under different circumstances, they are accepted in their entirety as congenial to the poetry of the East: so much so that a mere change of form is required to transplant them from one field of experience to the other. The theory concerns the power of imagination and even when some clue is found to it, it is not easy to present a quite satisfactory proof of it. It is difficult to trace out, from the finished article which alone is available for scrutiny, the raw material imported from the plain of Karbala. Yet the more deeply one studies the poets and other literary writers of the East, the more will one find material in support of this theory. In presenting the following illustrations endeavour has been made in the case of dead poets to select only those instances which may more or less be directly and easily traceable to the events, In order to illustrate how the event has indirectly affected poetry, works of great living poets have been availed of. Such a proof must be complicated from its very nature. It requires delicate handling and a vast knowledge of literature and its history to appreciate the preciseness of the remarks. Selections have therefore been made in such cases from the living poets to afford a short cut of a personal verification of the truth of the assertion by the author.

To begin with the illustrations of the latter kind:-
Maulana Safi, the will known living poet of Lucknow, says in one of his Ghazals:-

Zor hi kea tha jafa-i baghban dekha kiay,
Ashyan ujra kiya ham natawan dekha kiay.

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے-
آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے-

in vogue took a deep root in the minds of people and at a time began to operate unconsciously and these thoughts asserted themselves afterwards in all their efforts whenever occasion arose. The amount of the tinge thus received varied according to the extent of their study and knowledge of that kind of literature. It is not necessary that every composer of a verse tinged with the Karbala colour should have himself studied the original literature containing those ideas The literature was saturated with these ideas which having been transmitted from one generation to another became consciously or unconsciously the subject of study of all the subsequent generations. In fact, the peculiar tone imbued in all the literary and philosophical knowledge of the Eastern Musalmans when dissected and traced backward to their origin, comes to the event of Karbala as the only secure starting point. The eastern poet thus indebted to this fountain head of knowledge though just as a proof is forgotten and only the proposition proved is remembered, he may have forgotten the source of his inspiration, and may be conscious only of a peculiar sort of idea being highly appreciated currency in literature.

The reason why such ideas flourished in poetry is something as follows:—

This was due to his whole hearted zeal to defend the cause of truth, due in its turn to his love of God, that Husain met with such a fate The Romantic love has many elements in common with the (spiritual) love for Deity. So the great example of the latter set by Husain affords a number of very high ideals which possess the placticity of being shaped into the ways of the former

Now the major portion of the poetry of the East, specially of India, is based on tragic ideas in which pangs of love and all possible troubles and hardships that can ever befall man are enumerated, as also all worldly aims for which man has to undergo hardships. The event of Karbala with its details covering a period some time before and after its occurrence

whom ever-living authors are drawn, sided with Husain and gavo that particular tone to the literature which has ever since been continually bequeathed. This happened to be the beginning of the time of the intellectual growth and expansion of the Mohammedan world. It was soon followed by a period of the nations best energies and most brilliant achievements. As stated above the religious sanctity gave to the event of Karbala a powerful hold on the mind of the community and the literature from the highest ethics down to the most romantic love poetry became permeated with ideas derived from it. Its transmission to future generations was due to the fact that at the time of political expansion of Mohammedan power, the converted and the conquered had naturall to study the new literature in order to understand the basis, the meaning and authority of the habits and institutions of their civilised conquerors. And subsequently when this newly formed nation of conquerors and the conquered saw the decline of its power in the East, there was paucity of new things of literary and philosophical interests and it had to fall back upon the same production of their ancestors which was pervaded with the said particular tone. Thus it was that the ideas derived from the event of Karbala and imbibed by the literature of the time caused, within all those who came under the influence of and in touch with Mohammedans, (irrespective of caste or creed), a quiet growth of ideas which bore its own impress and influenced most important and decisive factors in the mental life of all the students of literature in the East. If the following four general axioms were remembered, namely:-

(1) That every event must have a cause.
(2) That the same cause always produces the same effect.
(3) That the same effect is always due to the same cause, and
(4) That there is a fixed proportion between a cause and effect.

We can see by minutely studying the literature down to the present day that the conscious study of the literature then

poet lives, moves and has his being which furnish him materials for his poems. The tragedy at Karbala became thus a fruitful store house consisting of a lot of elements which served as a perpetual source of new Similies and Metaphors and supplied plenty of raw material for the poet's genius to shape it into beautiful forms.

Of the two kinds of facts, the bright and the gloomy the latter seizes the mind more firmly and leaves comparatively more lasting effects on it. It is also generally accepted that the sentiment of sorrow imparts eloquence to the tongue. Tradition goes a step further and ascribes the very coming of poetry into existence in the world to tragic feelings for it says that the first poetic expression was the elegy on the murder of Abel the son of Adam composed by his own brother Cain in 3871 B. C. on repentance at his brutal act. The truth of the assertion is borne out by the fact that tragedies have succeeded better than comedies in almost all countries In India specially about $\frac{3}{4}$ths of the verses are full of tragic ideas.

Therefore, the more an event produces sad emotions, the more strongly it is likely to touch the mental cord whose vibrations send forth poetry. The intensity of emotion in its turn is in proportion to the strength of the case producing it and its hold upon the mind.

The event at Karbala is regarded as the most tragic one in the annals of history and its religious sanctity peculiarly and strongly appealed to the Eastern mind. The ideas that are uppermost or constant in the mind determine the tone of all the works. The uppermost and constant ideas of men of letters of the time had all a reference to the events of Karbala which produced a state of intellectual and political fervour among the race. This produced an indelible mark of its own on the literature of the time of which the constant theme was a love of Diety. The tone of the literature could have been otherwise also, but the more intelligent men from among

the philosophical aspect of the result of the event that has been discussed and effort has been made to demonstrate here its effect on the literature and poetry of the East with particular reference to Ghazals a form of Eastern poetry in which are chronicled the events of romantic love extending from appreciation and description of human beauty down to love of nightingle for the rose and its supposed wailings for it and also other non-religious poetry.

It is a matter of common knowldge that a number of similies and metaphors have been originally borrowed and introduced into literature of every country from ideas suggested by observation of natural phenomena, e. g. the Sun, Moon, Stars, Waterfalls and forests etc. Most of the poetic ideas are thus nothing but mental interpretations of external facts or the material occurrences upon which we have pondered long. Facts are the sense impressions interpreted by our mind so that they receive a meaning which intelligence stores up for future use. Poetry is an expression in measured language of ideas, emotions, feelings and sentiments, created by all the inner expressions of the outer world–facts–the effects of change. Changes of importance consequently affect poetry as in fact they do all literature. It must be admitted that every great event of the world changing as it does the various phases of the life of a country affects its literature in varying degrees. The effect of the French Revolution and other similar great historic upheavals may be quoted by way of illustration.

The tragedy at Karbala brought about changes by producing a strong revolution in the temporal spheres of the Mohammedan world. This was affected by the newly taught politico-religious tenets of Islam, while there were constant changes in secular power, a tendency grew up on the moral side to struggle for the support of truth even though it may involve death in howsoever horrible and degraded a form. The whole fabric of political, social and moral environment was changed. As stated above, it is the change in environments in which a

IE ISLAMIC WORLD
BUDAUN. U. P.

Vol 6 | OCTOBER, 1942. | No. 2

The Effect of the Karbala Event on Eastern Literature.

I have not ventured to launch this bold theory before ascertaining, as best as I could, how it would be received by men of letters and the little diffidence that I had in hazarding its publication, was removed by the letters of approbation of such illustrious men of the day as Shamsul-Ulama, Maulana Imdad Imam of Bankipore, Maulana Safi of Lucknow, and Maulana Zamin of Hyderabad, Deccan

The proposition which is intended to be set forth is that the great event of the assasination of Husain, the grandson of Mohammad, the prophet, which took place in 61 Hijra on the plains of Karbala near the Euphrates, has not only like other great event of History, left its impression on the eastern world by giving a special tone to the social, moral, political and other aspects of the east but also unlike most of the events of the world, has indelibly influenced poetry.

Letting alone the religious aspect of this historic event we find that Marsias (elegies) and other religious poems which contain a vast store of valuable information can be studied from a different stand point. It is only what may be called

"The effect of Karbala Event on Eastern Literatu

There is hardly any student of Islamic History who may not be aw sad event of Karbala Tragedy. The Hero being Imam Husain the gra. Holy Prophet Mohammad (peace be upon him & his al) The Tyranny of Yazid is also an open secret. For some time the enemies of the family of the Holy Prophet of Allah tried to save the Tyrant Yazid from all sorts of blames by drawing curtains of different colours against his (Yazid's) mischiefs. For some time people were kept quite in dark about this sad event and when the fact was known far and wid the rulers of Umaiya family, for that grave enmity which they had for the family of the prophet of Allah in the bottom of their hearts did not allow people to show sympathy with the Martyr of Karbala and it was on this very account that this great event of human history could not get publicity for several centuries. It can not be denied that the lovers of truth who had full faith in the prophet of Allah and had due regard for his family in their hearts tried to disclose this secret through their poetical works and the remembrance of the s event was not altogether ignored. Time passed on and circumstances allow people to say what they had in their hearts poets and other literary person egan to write things in this concern. For some time it was limited with Arabic guage only. But afterwards Persian and Urdu poets played their best part, thing could not be traced traced easily as to when and how the Eastern literary persons have expressed in their different works the sad event of Karbala. Our learned friend Sh. Mumtaz Husain of Jaunpur, a scholar of Eastern literature and history in his research work "The effect of Karbala Event on Eastern Literature" has supplied volumes of information to seekers after truth specially to those who want to understand that our Lord Husain on account of his sacrifice for the cause of righteousness has enlisted with him the sympathy of the people of different nationalities and the Muslims of different creeds., Although the contribution is concise yet it speaks volumes of the knowledge and research of the learned author.

(Haidri.)

Regd. No. A. 378.

THE

ISLAMIC WORLD

BUDAUN. U. P.

Vol. (...-SEPT. 1942. No. 2.

SUBSCRIPTION.

IN A ... SINGLE COPY (INDIA) -/8/-

FC ... ... FOREIGN -/12/-

HONORARY EDITOR
Dr. S. E. A. SHAH NAQAVI.

MANAGER & PUBLISHER
ALI ASHRAF
Kazi Tola, BUDAUN.

Printed by L. Ram Saran Lal Rastogi at the Shanti Press, Budaun.